بخش اردو

ڈاکٹر محمد سلطان شاہ اصلاحی
استاد شعبۂ عربی جامعۂ کشمیر

البیرونی اور محمود کے باہمی علائق

اس جہانِ آب وگل میں ابتدائے آفرینش سے اب تک نہ معلوم کتنے عرب آدم زاد پیدا ہوئے اور عدم آباد کو روانہ ہوئے مگر ان میں سے معدودے چند کا ذکر باقی ہے خذف ریزوں کا تو ذکر ہی کیا ان میں بھی کتنے ہیں جو کوہ نور کہلائے جا سکیں۔ ابوریحانؔ محمد ابن احمد البیرونی بھی ایسے ہی موتی، آبدار اور علاّمہ نامدار ہیں جنہوں نے علم وادب کی دنیا میں وہ کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں جو عصر حاضر میں سرکاری سرپرستی کے باوجود علمی اکیڈمیاں انجام دینے سے قاصر ہیں۔ ایسی جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے جمیع پہلوؤں پر ایک مختصر سے مقالے میں روشنی ڈالنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہوگا۔

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

اس لئے میں نے ایک ایسا موضوع اختیار کیا جو مختصر ہے مگر لائق اعتنا بھی۔ اہل قلم حضرات نے اس سلسلے میں جو سرسری خامہ فرسائی کی ہے وہ مختلف فیہ ہے

اور تحقیق طلب بھی۔ یہ موضوع بحث ہے۔

''البیرونی اور محمود کے باہمی علائق''

البیرونی اپنے استغناء کی وجہ سے نہایت تنگ دست اور مفلوک الحال تھے۔ اس کے متعلق وہ خود ہی ''الاثار الباقیة عن القرون الخالیة'' میں یوں رقمطراز ہیں:

''یہ فصل مجھ کو ایک ایسی حالت کی یاد دلاتی ہے جس پر احمد ابن فارس کا یہ قول صادق آتا ہے:

قد قال فیما مضی حکیم　　ما المرء الا بأصغریه

گذشتہ زمانے کے ایک حکیم کا ارشاد ہے کہ آدمی اپنے دو چھوٹے عضو یعنی دل اور زبان سے آدمی ہوتا ہے۔

فقلت قول امرء لبیب　　ما المرء الا بدرهمیه

لیکن میں نے ایک عقلمند آدمی کا یہ قول بیان کیا کہ آدمی اپنے دو درہموں سے آدمی ہوتا ہے۔

من لم یکن عنده درهماه　　لم تلتفت عرسه الیه

جس کے پاس اس کے دو درہم نہ ہوں سو اس کی رفیقۂ حیات بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔[۱]

اس تنگ دلی اور بدحالی کی وجہ سے اس کا تعلق بادل ناخواستہ قابوس کے دربار سے ہوا۔ اس کے بعد اس کا تعلق خوارزم شاہی دربار (۳۸۴ھ۔۳۹۰ھ) سے ہوا۔

اس دربار میں البیرونی کو نہایت عزّت و احترام حاصل ہوا۔ اس قدر کہ خوارزم شاہ البیرونی کے پاس جا کر کہتے ہیں:

العلم من اشرف الو لایات یاتیہ کل الوریٰ ولا یَاتی

علم سب سے زیادہ معزز ملک ہے کہ تمام لوگ اس کے پاس آتے ہیں اور وہ خود نہیں آتا۔

اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں:

لو لا رسوم الدنیاویّة لما استدعیتك فالعلم یَعلو ولا یُعلیٰ

اگر دنیا کا دستور نہ ہوتا تو میں آپ کو نہ بلواتا کیونکہ علم بلند ہوتا ہے اسکے اوپر بلندی نہیں حاصل کی جاتی۔(۲)

۴۰۸ھ میں محمود غزنوی نے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو خوارزم شاہیوں کی تباہی کے بعد البیرونی کا تعلق سلطان محمود غزنوی کے دربار سے ہوا۔ لیکن یہ تعلق کیونکر پیدا ہوا؟ اس کے متعلق معققین اور ادباء نے مختلف آراء بیان کی ہیں۔

یاقوت حموی، معجم البلدان، جزء (۱۷) ص ۱۸۶ میں اس کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

۔"وحدثنی بعض اهل الفضل: انّ السبب فی مصیره الی غزنة انّ سلطان محمود لما استولی علی خوارزم قبض علیه وعلی استاذه عبد الصمد الاول بن عبدالصمد الحکیم، واتّهمه بالقرمطته والکفر فاذاقه الحمام وهمّ ان یلحق به ابا الریحان، فساعده فسحته الأجل بسبب خلّصه

من الفضل، وقيل له: انه امام وقته في علم النجوم، وان الملوك لا يستغنون عن مثله، فاخذه معه و دخل الى بلاد الهند واقام بينهم واقتبس علومهم، ثم اقام بغزنة حتى مات"

مجھ سے بعض اہل فضل نے یہ بتایا کہ اس کے غزنہ جانے کی وجہ یہ ہے کہ سلطان محمود نے جب خوارزم کو فتح کیا تو البیرونی اور اس کے استاد عبدالصمد حکیم کو گرفتار کیا اور اس پر باطنیت اور کفر کا الزام لگا کر عبدالصمد کو قتل کیا اور ابوریحان کو بھی قتل کرنا چاہا لیکن اس وجہ سے بچ گیا کہ محمود سے کہا گیا کہ وہ علم نجوم میں اپنے وقت کا امام ہے اور سلاطین اس جیسے شخص سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ (چنانچہ سلطان اس کے قتل سے باز رہا) اور اس کو اپنے ساتھ بلاد ہند میں [illegible] کے علوم سیکھے پھر غزنہ میں قیام اختیار کیا اور وہیں وفات پائی۔

مشہور مستشرق ایچ۔اے۔آر گب لکھتے ہیں:

"Mahmud did not rely on his reputation for generasity to attrect scholors and men of letters. His method was cheeper and more effectine; he kidnaped them or exacted them as tribute from the states he conquered. It was thus that, on the conquest of Khwarizm, he become the partron of al-Beruni(d.1046), who more than any other writer, represents for us the genius of Islamic Science."[3]

اس طرح کی کئی اور روایتیں اس سلسلے میں بیان کی گئی ہیں جو باہم متصادم ہیں جیسے

نظامی عروضی سمرقندی کا چہار مقالہ ص ۷۷،

شوقی ضیف کی تاریخ الادب العربی ج ۵ ص ۵۳۰،

گنجینہ سخن جلد اول ص ۲۸۸، از ذبیح اللہ

ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر ''شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا'' والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ اسلئے سید حسن برنی صاحب ٹھیک ہی لکھتے ہیں کہ:

''موجودہ روایات کی کمزوری اور صحیح واقعات کی گم گشتگی کی وجہ سے ہم مجبور ہیں کہ البیرونی کی تصنیف اور واقعات پر غور کرتے ہوئے کوئی قیاسی نتیجہ اخذ کریں'' [۴]

چونکہ البیرونی کی زندگی کا آخری زمانہ غزنی ہی میں بسر ہوا۔ اسی زمانے میں اس نے محمود کے ساتھ ہندوستان کی سیاحت کی اور ہندوستانی علوم وفنون سے متعلق تمام کتابیں اسی دور کی تخلیقات ہیں۔ علماء وادباء نے ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد محمود اور البیرونی کے

باہمی علائق پر اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے

اس سلسلے میں ڈاکٹر اڈورڈ سخاؤ نے ''کتاب الہند'' کے انگریزی ترجمہ کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ سلطان محمود سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ مگر ان کے پیش نظر البیرونی کی دوسری کتابیں نہ تھیں۔ ہمارے نابغہ عصر اور یکتائے روزگار خطیب ونثر نگار ابوالکلام آزاد (جن کی نثر کو دیکھ کر ''نظم حسرت میں کوئی مزہ نہ رہا'') ''تہدید الاماکن'' سے یہی رائے اخذ کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس عبادت سے:

.....وأنا ممتحن مما أظن أن نوحا ولوطا علیهما السلام لم

يمتحنا بمثله وراج أن أكون ثالثهما في نيل رحمته الله والغياث بمنّه....."

میں آج کل ایسی آزمائشوں کے اندر ڈال دیا گیا ہوں کہ شاید حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام بھی ایسی آزمائشوں میں نہ ڈالے گئے ہوں گے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ خدا کی رحمت کے حصول اور اس کی طلب وفریاد کے لحاظ سے ان دونوں کے ساتھ میں تیسرا ہوں"۔[۵]

مذکورہ بالا دونوں حضرات کی رائے سے اختلاف کی گنجائش ہے، اسلئے کہ ڈاکٹر ایڈورڈ سخاؤ کے پیشِ نظر کتاب الہند کے سوا البیرونی کی دوسری تصانیف نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ البیرونی نے سلطان غزنی کے کاتب ابوالفتح بُستی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں اس نے سلطان محمود کے حسانات کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے:

ولم ينقبض محمود عن نعمة فأغنى وأقنى مغضبا عن مكاسيا

سلطان محمود کسی نعمت کے بخشنے میں کبھی کوئی دریغ روا نہ رکھا، مجھے کافی دیا اور میری سخت طلبی سے چشم پوشی کی۔

عفا عن جهالاتي وأبدى تكرّما وطرّى بحاه رونقي ولباسا

میری حماقتوں سے درگذر کیا، میری عزت افزائی کی، اور اسکے جاہ مرتبت سے میرے دن پھر گئے۔

عفا على دنياى بعد فراقهم و واحزنى ان لم أزر قبل آسيا

یہ لوگ نہ رہے تو میری دنیا تاریک ہوگئی۔[۶]

یہ اشعار البیرونی نے محمود کی وفات کے بعد کہے ہیں۔ اس قصیدے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آل عراق، منصور، اولاد مامون اور ابونصر بن منصور کے علاوہ محمود نے بھی ان کی سرپرستی اور خوب پذیرائی کی ہے۔

ہمارے آزاد مرحوم نے "تھدید نھایات الاماکن" کی مذکورہ عبادت سے جورائے قائم کی ہے اس کے ساتھ اختلاف کی گنجائش ہے۔ کیونکہ اگر واقعی البیرونی اور محمود کے درمیان کشیدگی ہوجاتی تو وہ "بما أظن أن نوحا ولوطا علیھما السلام لم یمتحنا" کے بجائے "أن ابراھیم و موسی لم یمتحنا" جیسے الفاظ استعمال کرتے۔ ان دو رسولوں کو نمرود و فرعون سے سابقہ پیش آیا تھا جبکہ نوح اور لوط علیہما السلام کو اپنی قوم سے۔ اسلئے یہ جملہ محمود کے بجائے اس دور کے اہل ہنود کی ترجمانی کرتا ہے، اور البیرونی کو ہندوستان کے علوم وفنون، عقائد ورسوم اور سنسکرت زبان سیکھنے کیلئے اہل ہنود ہی سے رابطہ قائم کرنا پڑا۔ اُس وقت انہیں اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں جناب عبدالسلام ندوی نے حکمائے اسلام میں یوں بیان کیا ہے:

(۱) ایسی مذہبی اور قومی بیگانگی کہ اپنے سوا دوسری قوموں کو ملیچھ یعنی نجس کہتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا بالکل ناممکن تھا۔

(۲) وہ رسوم وعادات میں مسلمانوں سے بالکل مختلف تھے، یہاں تک کہ مسلمان کی وضع قطع سے اپنے بچوں کو ڈراتے تھے اور ان کو شیطان سمجھتے تھے۔

(۳) محمد ابن قاسم کے زمانے سے محمود غزنوی کے زمانے تک کی اسلامی فتوحات

نے جن کی وجہ سے ان کا تمام علمی اور قومی شیرازہ پراگندہ ہوگیا تھا، ان کو مسلمانوں کا اور بھی زیادہ شمن بنادیا تھا''۔[۷]

پھر سلطان محمود غزنوی کی سیرت کے بارے میں خود آزاد مرحوم ہی لکھتے ہیں کہ اس میں عزم وعمل اور ہمت وشجاعت کے بے نظیر اوصاف تھے۔ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا فوجی سپہ سالار تھا۔ اس کی حکمرانی کا دامن شخصی حکمرانوں کے ظلم وستم کے عام دھبوں سے کم داغدار ہوا۔ وہ بقول انگریزی مؤرخ گب کے میدانِ جنگ میں کتنا ہی خونخوار نظر آتا ہو مگر تختِ حکومت پر عدل ومساوات کا خواستگار تھا۔ لیکن ان تمام اوصاف کے ساتھ اس کی دماغی شخصیت کا دوسرا رُخ بھی ہے۔ وہ کامل معنوں میں اپنے عہد کا ایک ترک سپاہی تھا اور علوم ومعارف کے میدانوں میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا''۔[۸]

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمود علوم ومعارف کے میدانوں میں کوئی قدم کیوں نہیں اٹھا سکتا تھا جبکہ اس دور کا رواج ہی تھا کہ بادشاہ اپنے دربار کی زینت کے لئے علماء وفضلاء کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اور ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ البیرونی ایک یکتائے روزگار اور نابغۂ عصر علاّمہ تھے۔ شہنشاہوں کے درباروں میں ان کے علم وفضل کا طوطی بول رہا تھا۔ خیر الدین زرکلی نے ان کے متعلق "أعلام" میں جامع بات کہی ہے کہ:

"وارتفعت منزلته، عند ملوك عصره" اس کے دور کے بادشاہوں (کے درباروں میں) اس کا مرتبہ بلند ہوا۔[۹]

اسلئے محمود نے اس کی جو پذیرائی کی ہے البیرونی نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ (اس کا ذکر ابوالفتح بُستی کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدہ میں کیا گیا ہے)

مزید یہ کہ محمود علوم وفنون کا دلدادہ اور علماء وفضلاء کا قدرداں تھا۔ اس کے ثبوت کیلئے اتنا کافی ہے کہ ۹۱۰ھ (۱۰۱۹ء) میں اس نے اپنے پایۂ تخت غزنی میں ''مسجدِ عروسِ فلک'' تعمیر کی۔ مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''اس مسجد کے ساتھ ہی سلطان محمود نے ایک عالیشان مدرسے کی بنیاد ڈالی اور مدرسے کے کتب خانہ میں نایاب اور اعلیٰ کتب جمع کیں۔ مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے بہت دیہات وقف کر دیئے گئے تا کہ طلباء، مدرسین اور دیگر عملے کی ضروریات پوری ہوسکیں''۔[۱۰]

ان مبارک اقدامات کو علوم ومعارف کی خدمات کے سوا اور کس نام سے یاد کریں؟ پروفیسر خورشید احمد نے بجا ہی فرمایا ہے کہ

''تاریخ نے محمود غزنوی کو اس کے عسکری حملوں کی وجہ سے تو یاد رکھا ہے لیکن علم کی دنیا میں جو انقلاب آفریں کام اس نے کیا اس کا قرار واقعی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اسے تاریخ کی ستم ظریفی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے''۔[۱۱]

حق بات یہ ہے کہ سلطان محمود غزنوی اپنے عہد کے طاقتور حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ دین سے حد درجہ محبّت رکھنے والے اور علوم وفنون کی آبیاری کرنے والے بادشاہ تھے۔ بلاشبہ ان کے اور البیرونی کے باہمی علائق بہت اچھے رہے ہوں گے۔

مراجع ومصادر

۱۔ ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی، الآثار الباقیته عن القرون الخالیته۔

۲۔ یاقوت حموی، معجم الأدباء، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۳۶ء، جلد ۱۷، ص ۱۸۳۔

۳۔ H.A.R.Gibb, History of Arabic Literature;

Rani Kapoor New Delhi; 1994: p.72.

۴۔ عبدالسلام ندویؒ، حکمائے اسلام، دارالمصنفین اعظم گڑھ، انڈیا، ص ۳۶۳۔۳۶۴۔

۵۔ ابوالکلام آزاد، البیرونی اور جغرافیہ عالم، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۹۴۔۹۵۔

۶۔ یاقوت حموی، معجم الادباء، جلد ۱۷، ص ۱۸۷۔

۷۔ عبدالسلام ندوی، حکمائے اسلام، ص ۳۷۵۔

۸۔ ابوالکلام آزاد، البیرونی اور جغرافیہ عالم، ص ۹۹۔

۹۔ خیرالدین زرکلی اَعلام، دارالعلم للملایین، بیروت، ۱۹۸۰ء، جلد ۵، ص ۳۱۴

۱۰۔ محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، مترجمہ وترتیب از عبدالحی خواجہ، سعد بک ڈپو، دیوبند، انڈیا، جلد اوّل، ص ۴۷۔

۱۱۔ پروفیسر خورشید احمد، اسلام کا نظریہ تعلیم، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۷۔